۱۹۶۹ء کی منتخب شاعری

۱۹۶۹ء
کی
منتخب شاعری

انتخاب و ترتیب:

کمار پاشی

پریم گوپال متّل

ناشر

پی، کے پبلیکیشنز، ۱۵/۱۷، آریہ سماج روڈ، قرول باغ، نئی دہلی ۵

بار اوّل : مارچ ۱۹۷۰ء
خطّاط : حشمت علی
سرورق : بھنوٹ
زیر اہتمام : کے، جی، متّل
مطبع : یونین پرنٹنگ پریس، دہلی
قیمت : تین روپے

پیش لفظ

سالانہ شعری انتخاب کا یہ سلسلہ ۱۹۶۷ء سے شروع کیا گیا تھا۔ ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء کے انتخابات کا جس گرم جوشی سے خیر مقدم ہوا اور انھیں جو پذیرائی حاصل ہوئی اس سے ہمیں یہ حوصلہ ہوا کہ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔

۱۹۶۹ء کا شعری انتخاب قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ہم اس مرتبہ پھر اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تخلیقات کا انتخاب کسی طے شدہ نظریے کے تحت نہیں کیا گیا بلکہ ہماری یہ کوشش رہی کہ موجودہ اردو شاعری میں جو گوناگوں تخلیقی و فکری رجحانات اور اظہار و اسلوب کے جو مختلف رنگ نظر آتے ہیں ان سب کی نمائندگی ہو سکے۔ اس مقصد میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا اندازہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

ہمارا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ ۱۹۶۹ء میں چھپنے والی تمام نمائندہ شعری تخلیقات اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ممکن ہے بعض عمدہ نظمیں/غزلیں ہماری نظر سے نہ گزری ہوں یا مجموعے کی کم ضخامتی کی وجہ سے شامل ہونے سے رہ گئی ہوں لیکن اس مجموعے کے مطالعے سے موجودہ اردو شاعری کی تخلیقی سمت و رفتار کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے اور یہی اس مجموعے کی اشاعت کا مقصد ہے۔

(مرتبین)

ہم ان شاعروں کا جن کی تخلیقات اس
مجموعے میں شامل ہیں اور ان تمام مدیران
کا جن کے رسائل سے یہ تخلیقات
نقل کی گئی ہیں، تہہِ دل سے شکریہ ادا
کرتے ہیں۔

نظمیں:

مجید امجد
منیب الرحمان
وزیر آغا
کرشن موہن
بلراج کومل
قاضی سلیم
سلیمان اریب
محمود ایاز
مخمور سعیدی
عادل منصوری
عمیق حنفی
ندا فاضلی
شہریار

عباس اطہر
اعجاز فاروقی
زبیر رضوی
امجد اسلام امجد
مغنی تبسم
فضل تابش
نثار ناسک
مظہر امام
وہاب دانش
علی اصغر
اسلم آزاد
کمار پاشی

غزلیں:

گوپال متل
عارف عبدالمتین
منیر نیازی
مشفق خواجہ
خورشید احمد جامی
رئیس امروہوی
فارغ بخاری
شہزاد احمد
شہاب جعفری
شاذ تمکنت
حسن نعیم
من موہن تلخ
محمد علوی
بشیر بدر
بشر نواز
راج نرائن راز
مراتب اختر

نشتر خانقاہی
شمیم حنفی
مصور سبزواری
اقبال ساجد
سلطان اختر
افتخار نسیم
ممتاز راشد
صبا اکرام
ماجد الباقری
بشیر احمد بشیر
مدحت الاختر
شکیل مظہری
آزاد گلاٹی
غلام مرتضیٰ راہی

مظفر حنفی
قمر اقبال
سلیمان خمار
نوبہار صابر

احمد آباد ۱۹۶۹ء

گوپال متل
بلراج کومل
مخمور سعیدی
عادل منصوری
صادق
کمار پاشی

نظمیں

مجید امجد

پھولوں کی پلٹن

آج تم ان گلیوں کے اکھڑے اکھڑے فرشوں پر چلتے ہو
بچو! آؤ تمھیں سنائیں گزرے ہوئے برسوں کی جنوریوں کی باتیں

تب یہ فرش نئے تھے
صبح کو لمبے لمبے اوور کوٹ پہن کر لوگ گلی میں ٹہلنے آتے
ان کے پراٹھوں جیسے چہرے ہماری جانب جھکتے،
لیکن ہم تو آپس میں
باتیں کرتے رہتے اور چلتے رہتے
پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ہمارے پاس آجاتے
بڑے تصنع سے ہنستے اور کہتے:
"ننھو! سردی تم کو نہیں لگتی کیا؟"

ہم سب بھرے بھرے جزدان سنبھالے
لو جس ہاتھوں میں لٹکاتے

تیز ہواؤں کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں میں بھر کر
بنا بٹن کے گریبانوں کے پلّو اُدھڑے ہوئے کاجوں میں بھر کر
چلتے چلتے تن کے کہتے :
"نہیں تو! کیسی سردی؟ ہم کو تو نہیں لگتی!"

بچو! ہم ان اینٹوں کے ہم عمر ہیں جن پر تم چلتے ہو
صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں بہتی آج تمھاری اک اک صف کی وردی
ایک نئی تقدیر کا پہناوا ہے!
اجلے اجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو!
تمھیں خبر ہے؟
اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے
اب وہ لوگ ہیں جن کا بچپن
ان خوابوں میں گزرا تھا جو آج تمھاری زندگیاں ہیں!

——— شب خون، الہ آباد

بُلبُلوں کے محل

بلبلوں کے محل
قید ہیں جن میں شام و سحر
جس نے رکھا قدم
بن گیا سنگ در
کون گزرا ہے اس راہ سے بے خطر

اور ان سے پرے
بادلوں میں گھرے
کوہساروں کے پھیلے ہوئے سلسلے
فاصلے فاصلے
ایک طائر کی پرواز بے جستجو
ایک آواز بھٹکی ہوئی کو بہ کو

——— شب خون، الہ آباد

ترغیب

کبھی تم جو آؤ
تو میں صبح کے جھٹپٹے میں
تمھیں سب سے اونچی عمارت کی چھت سے دکھاؤں
درختوں کے اک سبز کمبل میں لپٹا ہوا
شہر سارا
کلس اور محراب کے درمیاں
اُڑنے والے مقدس کبوتر
بہت دُور ــــ چاندی کے اک تار ایسی ندی
اس سے آگے
جری کوہساروں کا اک سُرمئی سلسلہ!

کبھی تم جو آؤ
تو میں ایک تپتی ہوئی دوپہر میں
تمھیں اپنے اس آہنی شہر میں لے چلوں
ایک لوہے کے جھولے میں تم کو بٹھاؤں

تمھیں سب سے اونچی عمارت کی چھت سے دکھاؤں
ملوں کے سیہ رنگ نتھنوں سے بہتا دھواں
تنگ گلیوں سے رستی ہوئی نالیاں
جو مساموں کی صورت
مکانوں کے جسموں سے گاڑھے پسینے کو خارج کریں
کھانستی، ہنکتی، شاہراہیں
ہراساں، غصیلی، تھکی ٹکیاں
پرانے، گرانڈیل پیڑوں کے کٹنے کا منظر
شکستہ عمارات کی ہڈیوں پر
مڑی چونچ والے
سیہ فام بل ڈوزروں کے جھپٹنے کا وحشی سماں!

کبھی تم جو آؤ
تو میں تم کو پلکوں پہ اپنی بٹھاؤں
تمھیں اپنے سینے کے اندر کا منظر دکھاؤں۔

——— ادبی ڈائجسٹ، راولپنڈی

کربِ آگہی

یہ کپٹیوں کی برف تخریب کا حرف ہے
مری زیست کا صرف ہے
مجھے تو ابھی تک غمِ تنگیٔ ظرف ہے

ہمیشہ رہا ہے مرا دامنِ دل تہی
کہانی رہی آن کہی
مصیبت بنی ہے مری جاں گسل آگہی

کبھی کھل کے احساس کا کھیل کھیلا نہیں
اگرچہ اکیلا نہیں
ہٹا میری رہ سے خرد کا جھمیلا نہیں

مری عمر کی کتنی ہی خوشنما منزلیں
محبّت کی وہ محفلیں
ہوئیں گرد اور سرد، بیدرد اب کیا ملیں ؟

رفیقوں کے طعنے تجھے تیر ہیں زہر میں
ملے کتنے غم دہر میں
خلوص و وفا ہیں کہاں قریہ و شہر میں

سحر کا سپیدہ محبت کا انجام ہے
جدائی کا پیغام ہے
شروعِ سفر ہے، اداسی کا ہنگام ہے

قریب آگئی وادیِ مرگ، لگتا ہے ڈر
نہیں ساز و برگِ سفر
مری روح کو راس آئے گا کیا وہ نگر؟

—— تحریک، دہلی

پرندہ

پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اُس پار جاتا ہے
پرندہ بال و پر ہے، آنکھ ہے لیکن —
سنہری چونچ سے پرواز کرتا ہے
سڑک پر دھوپ ہے اور دھوپ میں سایوں کے ناخن ہیں
گھروں میں خول ہیں اور آنگنوں میں خار اُگتے ہیں
کسی کا کون ہے؟ کوئی نہیں! سب اجنبی ہیں، حیرت و حسرت میں زندہ ہیں

وہ عورت ہے
وہ خواہش کے لپکتے خنجروں سے پیار کرتی ہے
وہ اس کا ہم سفر ہے، خاک و خوں اس کا مقدر ہے
یہ موجِ آب ہے، اب پھول ہے، اب پیڑ ہے، کل صرف پتّہ ہے
اگر یہ زندگی کرنے کی کوشش میں پریشاں ہیں
یہ اکثر قتل کرتے ہیں
یہ اکثر قتل ہوتے ہیں
لہو کے پار گلشن ہے، مگر گلشن لہو میں ہے
نگاہوں میں اجڑتے شہر کی مانند تصویروں کا میلہ ہے

ہجومِ سنگ و آہن میں
کوئی آواز دیتا ہے، کوئی آواز سنتا ہے
مگر آواز سے آواز کا رشتہ نہیں ہوتا
مگر آواز سے آواز کا ہر سلسلہ بے کار ہوتا ہے

یہ منظر تیرتا ہے آب جُو میں ہائے! لیکن اجنبی کیوں ہے؟
میں منظر ہوں تسلسل ہوں
مگر میں اجنبی کیوں ہوں؟
یہ فرشِ آب و گل میرے لئے اک سلسلہ کیوں ہے؟
پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اُس پار جاتا ہے
پرندہ فاصلہ کیوں ہے؟
پرندہ ماورا کیوں ہے؟

——— آجکل، دہلی

قاضی سلیم

بے زمینی

باد گولے
— بگولے
پے بہ پے اٹھ رہے ہیں
سینۂ ارض کی سانس اکھڑنے لگی ہے
بنی نوع آدم کے شجرے کی سوکھی ہوئی پتیاں
بوکھلائی ہوئی — گھومتی پھر رہی ہیں
راستہ کس طرف جا رہا ہے

میری دھرتی کہاں ہے
ٹمٹماتا ہوا دیپ کب تک جلے گا
اسے کیا پتہ ہے
راستہ کس طرف جا رہا ہے

خلاؤں کے بے آب ساگر امڈتے چلے آ رہے ہیں
کتنے آہوئے رم خوردہ رفتار کی قید میں

آج بے پاؤں اور بے زمیں چوکڑی بھر رہے ہیں
راستہ کس طرف جا رہا ہے

جیسے ہر ہر قدم پہ
گھڑ گھڑاتے ہوئے بادلوں سے
کوئی چیختا ہے
ایک ہی راستہ رہ گیا ہے
زادِ رہ پھینک دو
اور اونچے اُٹھو
اور اونچے اُٹھو
بے حاصلی کے سُبک ہاتھ پھیلاؤ
— جیسے فرشتے
ہواؤں کو بانہوں میں بھر کر
عرش سے فرش تک
آتے جاتے ہیں — سب راستے
ساری سیمائیں اُن کے لیئے بے اثر ہیں

کروڑوں برس ہم نے اس فکر کا بوجھ ڈھویا
آئینے کے تلے — تم کبھی اُترے ہو

— میں نے بھی اک عمر یا تال میں کاٹ دی ہے
الجھے دھاگوں میں پھر کی کہاں گھومتی ہے
اس کا محور کہاں ہے
یہ کھلتی چلی ہے — یا اسے انگلیوں پہ
روز و شب کوئی اُلٹا لپیٹے چلا جا رہا ہے

تم نے مجھ سے کہا تھا
درختوں کو ننگا کرو
سارے پھل پھول پتّے
لفظ کے جال ہیں
آبادیوں میں ہماری نظر
صرف چہروں پہ پڑتی ہے
— اُس پار جاتی نہیں
مگر آج جب
نہ چہرے، نہ پتّے، نہ الفاظ
— کچھ بھی نہیں
اب بتاؤ مجھے
راستہ کس طرف جا رہا ہے

— آہنگ، دہلی

دو نظمیں

پانچ سطریں

قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے رات
چاندی چاندنی پگھل رہا ہے چاند
وقت کے ریگ زار دریا میں
ذرّہ ذرّہ بکھر رہے ہیں تمام
اس زمیں پر نہیں کسی کو دوام

خاکم بدہن

اگر یہ کفر کلامی نہ ہو تو عرض کروں
خدائے قادرِ مطلق نے کہہ کے کن فیکون
یہ کائنات تو انساں کو بخش دی لیکن
نہ سوچا کس طرح یہ مشتِ خاک سنبھلے گا؟
سزائے زیست کہ جس کی نہیں کوئی میعاد

——— شب خون، الہ آباد

نوحہ

سیہ رات، میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
خروشاں سمندر کی موجیں تجھے ڈھونڈتی ہیں
خروشاں ہوا کی صداؤں میں تیری صدا ہے
مرا دل تجھے ڈھونڈتا ہے

سیہ رات اشکوں کی شبنم میں سوئی ہوئی ہے
ہر اک پل، ہر اک لمحہ ماضی کا، زندہ ہے، موجود میں جاگتا ہے
مگر تیرا پیکر
تہہِ خاک اندھیروں کے دامن میں سویا ہوا ہے
مرا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے، تجھے ڈھونڈتا ہے

میں آسودۂ ریگ، خاموش، اس رات کی جلتی آنکھوں کو دیکھوں
سیہ رات میں ٹمٹماتے ہوئے ان ستاروں سے پوچھوں
خروشاں سمندر میں ڈوبا ہوا چاند کس اجنبی سرزمیں پر تبسم کناں ہے؟
نقوشِ کفِ پا کی منزل کہاں ہے؟

یہ زندگی سیل در سیل بہتا ہوا
ایک لمحے کو رک کر پلٹ کر نہ دیکھے
سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
فقط اک شبِ بے صدا جاگتی ہے
شبِ بے صدا پوچھتی ہے
بپھرتی ہوئی موجِ دریا کدھر سے چلی تھی؟
کدھر کو چلی ہے؟
ترا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے
کسے ڈھونڈتا ہے؟؟

——— تحریک، دہلی

مخمور سعیدی

خون کا آسیب

تمھیں مُبارک ہو قتلِ دُشمن
عبث تردّد، عبث یہ اُلجھن
وہ بے گنہ تھا کہ تھا گنہ گار، ــ اس کو تم نے جب اپنا دشمن سمجھ لیا تھا
تو واجب القتل بھی وہ ٹھہرا
کٹا ہوا سر بہ طورِ تمغہ
سجا کے سینے پر اپنے تم گھومتے پھرو اب
ابھی کسی کو ہوئی ہے اس راز کی خبر کب
جسے تم اپنی بہادری کہہ رہے ہو دراصل بزدلی تھی
تمھارے ہاتھوں میں تیز خنجر تھا، بازوؤں میں سکت تھی
مقتول ناتواں تھا
فرار، اک سعیِ رائیگاں تھا
مگر تمہاری ظفر مند آنکھوں میں اس کی بے چارگی کا جو عکس رہ گیا ہے
یہ عکس شاید نہ چپ رہے گا
یہ سب سے یہ ماجرا کہے گا!
کہ وہ نہتّا تھا اور نفرت کا تیز خنجر لیے تم اُس پر جھپٹ پڑے تھے

کہ تم تھے خنجر بکف تو دیوارِ خوف میں اس کے نیم جاں دست و پا گڑے تھے
تمہاری آنکھوں میں اس لہو بستہ منظرِ بے زباں کا جو عکس آبسا ہے
کسی کے آگے تمھیں نہ آنکھیں اٹھانے دے گا
یہ عکس ہرگز نہ چُپ رہے گا
یہ سب سے یہ ماجرا کہے گا...

——— انتخاب، گلبرگہ

عادل منصوری

ایک نظم

بتوک آواز دے رہا ہے
زمیں سے اب جو چپک رہے گا
منافقوں میں شمار ہوگا
لہو کے سورج کی لال آنکھیں
اُداس لمحوں کو سونگھتی ہیں
کھجور پکنے کا وقت بھی ہے
سفر کٹھن ہے
سواریاں اور سفر کا سامان ساتھ لے لو
سفر کٹھن ہے
تمہارے اونٹوں کی گردنوں سے
تمام دنیا میں نور پھیلے
تمہارے گھوڑوں کی ہنہناہٹ
تمہاری منزل کی راہ کھولے

بلندیوں کی طرف بلاتا ہے
آج کوئی
یہ دھوپ سائے کے ساتھ ہوگی
ہوا میں ہنستا نشان دیکھو
یہ اڑتے پرچم کی شان دیکھو
ابھی ابھی قافلہ گیا ہے
بتوک آواز دے رہا ہے
میں اپنے گھوڑے کی باگ
موڑوں
میں اپنے گھر کی طرف
نہ جاؤں

——— آجکل، دہلی

ایک معصوم سوال

کیوں بھڑک اٹھتی ہیں اخبارات کی رہ رہ کے کالی سرخیاں؟
ریڈیو لہروں میں کیوں بارود کی بُو پھیل جاتی ہے؟
کیا کتابیں، فلسفے، پرچم بدل دیتے ہیں
انسانوں کی شکلیں، سینہ و سر، جسم و جاں؟
کیوں بگاڑا کرتے ہیں چہرے نقابوں کے لیے ہم؟
زر، زن، زمیں، ملّت، وطن، فرقوں کی لے کر آڑ
قتل و غارت پر اُتر آتے ہیں کیوں؟
ویت نامی، چیک، مصری، اردنی، اسرائیلی، روسی لہو
لال، پیلا، گاڑھا، پتلا، مختلف ہوتا ہے کیا؟
لوگ کیوں انسانیت کے نام پر
خونِ انساں سے زمیں کو سرخ کر دینے کا سودا پالتے ہیں؟
نعرۂ انسانیت کو
گردنِ انساں میں کیوں پھانسی بنا دیتے ہیں لوگ؟
کیوں ہزاروں سال سے ہوتا چلا آتا ہے ایسا؟

——— تحریک، دہلی

آدمی کی تلاش

ابھی مرا نہیں زندہ ہے آدمی شاید
یہیں کہیں اسے ڈھونڈو
یہیں کہیں ہوگا
بدن کی اندھی گپھا میں اُتر گیا ہوگا
بڑھا کے ہاتھ ہر اک روشنی کو گل کر دو
ہوائیں تیز ہیں جھنڈے لپیٹ کر رکھ دو
جو ہو سکے
تو ان آنکھوں پہ پٹیاں کس دو
نہ کوئی پاؤں کی آہٹ
نہ سانس کی آواز
ڈرا ہوا ہے وہ کچھ اور بھی نہ ڈر جائے
بدن کی اندھی گپھا سے نہ کوچ کر جائے
یہیں کہیں اسے ڈھونڈو
وہ آج صدیوں بعد
اداس اداس ہے
خاموش ہے
اکیلا ہے.....!
نہ جانے کب کوئی پسلی پھڑک اُٹھے
اس کی.....!
یہیں کہیں اسے ڈھونڈو یہیں کہیں
ہوگا
برہنہ ہو تو اسے پھر لباس پہنا دو...
اندھیری آنکھوں میں سورج کی
آگ دہکا دو
بہت بڑی ہے یہ بستی کہیں بھی
دفنا دو
ابھی مرا نہیں
زندہ ہے آدمی شاید

—— اوراق، لاہور

تلاش کی ایک منزل

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
دور تتلیوں کے ریشمی پروں کے نیلے پیلے رنگ
اڑ رہے ہیں ہر طرف
فرشتے جیسے آسمان سے اُتر رہے ہیں صف بہ صف
میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
آنسوؤں کی اوس میں نہا کے بھولے بسرے خواب آ گئے
خون کا دباؤ اور کم ہوا
نحیف جسم پر کسی کے ناخنوں کے آڑے ترچھے نقش جگمگا اٹھے
لبوں پہ لکنتوں کی برف جم گئی
طویل ہچکیوں کا ایک سلسلہ فضا میں ہے
لہو کی بو ہوا میں ہے

—— شب خون، الہ آباد

عباس اطہر

ایک نظم

بیمار قوموں کے
محتاج ملکوں کے بیٹے
اندھیرے کی دیوار کو چاٹتے چاٹتے، سو گئے
ٹیکسیاں اور رکشے بلاتے رہے، سو گئے
آج ہم بازوؤں پر سیہ پٹیاں باندھتے،
اور ہنستے ہیں

"آؤ! تمہیں ماں بلاتی ہے
اُس نے تمہارے لیے سبز چائے بنائی ہے
پھولوں کے بستر پہ خوشبو کی چادر بچھائی ہے"
کوئی نہ آؤ ــــ میں اونچی پہاڑی پہ تنہا کھڑا چیختا اور روتا رہا
کشتیاں چھوڑ کر کون آتا کہ سیلاب کا زور تھا
آدمی بھیڑیں اور بکریاں بن گئے
آدمی ہی گڈریے بنے، آدمی ہی قصائی ہوئے
اور تکّے کبابوں کے بازار بڑھتے گئے

مسکراتے رہو، گھاس چرتے رہو
جب تلک یہ زمینیں حمل کی تمنا سے لبریز ہیں
اور ان کی تمنا میں جیتے رہو
جو دریا دلی اور نیکی کی آغوش میں، کھو گئے
شہوتوں، چاہتوں اور محرومیوں کے لبادے بدل کر
جو اپنے لیے اجنبی بن گئے
اور جو چڑھتے سورج کی چوکھٹ پہ پانی ہوئے
اور جنازے گزرتے گئے
آگے پیچھے، جوانمرگ ملکوں کے
مغلوب قوموں کے
کوئی نہ آیا کہ سیلاب کا زور تھا
کشتیاں چھوڑ کر کون آتا۔

——— دستاویز، دہلی

سنگِ میل

وہ ایک پتھر
وہ سخت، کالا سیاہ پتھر
لہو سے تر
جس کی تیرگی ناگ بن کے ڈستی تھی
جس کی سختی سے کوہساروں کے دل دہلتے تھے
جس کی خوں تشنگی سے کومل شجر فقط ٹہنیوں کی حسرت کے زاویے تھے
وہ ایک پتھر ــــ جو تو نے پھینکا
مرے سمندر میں حرکتِ لازوال کا ایک تازیانہ بنا
وہ لہریں اٹھیں
کہ خاموش چاندنی کی حسین چادر بھی تھرتھرائی
وہ جھاگ کا نور تیرگی کے سیاہ پردوں کو چاک کرنے لگا
وہ شیشے کی ایک دیوار
جس کو تو یہ سمجھ رہا تھا
کہ ایک ٹھوکر سے چور ہو گی
وہ ایک سونے کا تھال بن کر دمک رہی ہے

ــــ اوراق، لاہور

دستِ مہرباں

چلو چل کر کسی خالی زمیں پر پھول مہکائیں
کہیں کیاری بنائیں اور کہیں پیڑوں کو لہکائیں
کہیں پانی سے فوّارے نکالیں اور کہیں چشمے
کہیں بجلی سے دھرتی پر شفق کے رنگ برسائیں
کہیں مہتاب چمکائیں کہیں شمعوں کو پگھلائیں
بہت زخمی ہے یہ دھرتی کسی اک زخم پر اس کے
مہکتی، جھومتی، فطرت کا دستِ مہرباں رکھ دیں

——— کتاب، لکھنؤ

وضاحت بے سود ہے

تمام رستے اُسی طرح ہیں
زمین اب بھی فلک کے سینے سے لگ رہی ہے
اُبھرتے سورج کی زرد کرنوں میں اب بھی سونا گھلا ہوا ہے
تمام چیزیں اُسی طرح سے رواں دواں ہیں
مغائرت کی ہوا نے لیکن عجیب جادو چلا دیا ہے
ملول صبحیں، اُداس شامیں
کچھ اس طرح سے گزر رہی ہیں کہ جیسے منظر بدل گئے ہوں
گئی رُتوں کا غبار لمحوں کی خشک آنکھوں میں اُڑ رہا ہے
ہر ایک منظر پہ چھا گیا ہے
مفارقت کا اداس لمحہ، رفاقتوں کے تمام پیکر فصیلِ غم پہ بنا گیا ہے
مغائرت کی ہوا تعلق کی ساری شمعیں بجھا گئی ہے، تمام رشتے مٹا گئی ہے
نگارِ احساس بے زباں ہے، عجب سماں ہے
گریزپائی کا ذکر ہی کیا؟ کہ دل کی قسمت میں ہی زیاں ہے
گزرتے لمحے، — تمہارے میرے لپکتے ہاتھوں کے پاس کب ہیں
تمام الفاظ بے سبب ہیں

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

آنکھ ملتے ہوئے

سنہری شب کہاں جاگی
فسونِ خواب میں لپٹے ہوئے کہرے کی تنہائی کا ہر منظر ادھورا ہے
ادھر نیلے جزیرے میں کسی بیتے ہوئے دل کی
کسی بسری ہوئی انجان خواہش نے ——
ادھر اک ناشناسا جھیل میں رقصاں کوئی پرتو
سفینے سے ——— چمکتی ریت کی آنکھوں میں جھانکو
وہاں پاتال کی حسرت اُگل دیتی ہیں آ کر
سُن رہے ہو غم زدہ موجوں کی پھنکاریں ؟
لہو کی گرمیِ آزار ! —— یہ کس کا مقدّر ہے ؟
یہ کس کے سرخ شعلوں کا بدن ہے ؟
دریدہ پیرہن کے گُل کہاں مہکے ؟

اٹھو —— تم کو بلاتے ہیں وہ پیمانے
جہاں ——
سُنو —— زنجیر کی جھنکار سنتے ہو؟

یہی ہے مرگ خاموشی کا نوحہ
اس طرف دیکھو ۔۔۔ وہاں اونچی چٹانوں سے زمانہ رس رہا ہے
یہی وہ آسماں ہے جس کو اپنی جیب میں رکھ کر چلے تھے
یہی وہ زندگی ہے
جس کو کل ہم اپنے بستر میں برہنہ چھوڑ آئے تھے

۔۔۔۔۔ شب خون، الہ آباد

فضل تابش

ایک نظم

تمھارے دانت
لمبے ہو کر ہونٹوں سے باہر نکل پڑے ہیں
سرخ دانت
میرے خون میں لت پت
تمھارے خون میں نہیں
کہ تمھاری آنکھوں سے قطرہ قطرہ مسلسل ٹپکتا رِستا
تمھارا خون
اس سے پہلے کہ لکیریں کھینچتا تمھارے گالوں کے جنگل سے نیچے اترے
کٹیلے جانوروں کی سی لمبی
بے قراری سے پورا جنگل جھاڑنے والی تمھاری زبان
دانتوں تک پہنچنے سے پہلے ہی چاٹ جاتی ہے
تم دونوں کا خون چاٹ رہے ہو
اپنا خون جھاڑ و زبان سے
میرا خون جانور دانتوں سے
جانور دانتوں سے

کہ میرا گوشت بھی چبانا پڑتا ہے تمھیں
مگر کبھی کبھار جب تم اپنا گوشت بھی کھاتے ہو
وہ میری فرصت کا وقت ہوتا ہے
کہ تمھارے دانت مشغول ہوتے ہیں
اور تمھاری زبان
میرا خون میرے جسم سے باہر نہیں نکال پاتی

تم نے جب بھی اپنا خون چاٹا ہے
میں نے اپنا خون رگوں سے نچڑتا محسوس کیا ہے
کیا تم نے کبھی
تمھارے جانور دانتوں میں ریشہ ریشہ بکھرتے میرے لوتھڑوں سے
اپنی موت کی چیخ سنی ہے
شاید نہیں
ورنہ تیزی سے گوشت کو ٹٹولتے دانت کبھی تو رکتے
کبھی تو مسوڑوں میں اٹکے ریشوں کی بدبو سے
ابکائی لے کر تم بڑی سی قے کرتے
تمھاری سوچ کا ثبوت صرف ایک بڑی اور سڑی
بدبو دار قے ہے

میرے گوشت یا خون کی بدبو سے نہ سہی
اپنے ہی خون کی سڑاند سے
مجھے ریشہ ریشہ بکھرتی شخصیت کا غم اب نہیں ہے
اب تو میں صرف تمھاری تے کے لیے زندہ ہوں
میں اپنی تے کے لیے بھی زندہ ہوں
تاکہ پوچھ سکوں
میرے اور تمھارے خون،
دونوں کے ریشہ ریشہ بکھرتے جسموں کی پہچان
کون اس پہچان میں رکاوٹ بنا ہوا ہے
مگر اور کوئی نہیں
وہ تم ہو
جھاڑ و زبان اور جانور دانتوں والے تم
وہ میں ہوں
ریشہ ریشہ بکھرتا ہوا
گم سُم میں

——— شب خون، الہ آباد

بلاوے کی گونج

تم یونہی
میرے دل پہ
دکھوں کی طرح
قطرہ قطرہ لہو بن کے گرتی رہو
اور جب یہ سفر ختم ہو جائے تو

میری آنکھوں کے
سنسان ساحل پہ تم
مجھ کو آواز دینا
میں آجاؤں گا ــــ
پانیوں سے گزرتی ہوا کی طرح

ــــ شاخسار، کٹک

دھوپ میں ایک مشورہ

تم کہاں جاؤ گے ؟
آج کے دن کہاں جاؤ گے ؟
صبح سے ہی ہوا گرم ہے
آفتاب اپنے خیمے سے پگھلا ہوا سیسہ برسا رہا ہے

بیٹھ جاؤ یہیں
اس خرابے میں تسکیں کے سامان ڈھونڈیں
تمھیں اپنی ماضی کی وہ داستانیں سنائیں
جنھیں دوسروں نے ابھی تک سُنا ہی نہیں ہے !

جگمگاتے تھے میری نباؤں پہ آدرش کے چاند تارے
آنے والے زمانے کے سورج
شہر کے جاگتے شور میں، میں نے اک اک کو آواز دی
میں نے اک اک سے پوچھا کہ تم مجھ کو پہچانتے ہو ؟
ایک طنز آفریں خامشی میرے ہمراہ چلنے لگی !

میں نے اپنی روایت کے سارے لبادے اتارے
اپنے چہرے کو تہذیب کے رنگ و غازہ سے ناآشنا کر دیا
اور تب لوگ ــــ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے !
آنسوؤں کی کہانی سنانے سے حاصل ؟
زخم خوردہ عقیدوں پہ مرہم لگانے سے کیا فائدہ ؟
تم اگر بند کمرے سے باہر گئے
اپنے ملبوس سے جھانکتی وحشتوں کو چھپاؤ گے کس خول میں ؟
لوگ گھبرا کے پوچھیں گے "تم قتل کر کے کسے آ رہے ہو ؟"
اور تم اپنے آدرش کی لاش کو
اجنبی، سرد، جلتی ہوئی رہگزر سے پرے پھینک کر لوٹ آؤ گے پھر
اور اک التجا، التجا.......
"مجھ کو پہچاننے کی نہ کوشش کرو !"

سامنے کے دریچے میں مہتاب اترے اگر
پھر چلے جاؤ گے
آج کے دن کہاں جاؤ گے ؟
تم کہاں جاؤ گے ؟
صبح سے ہی ہوا گرم ہے !

ــــــ کتاب، لکھنؤ

وہاب دانش

نظم

میں غلط تھا کہ شام چھوٹی تھی
زرد سورج گواہ تھا اس کا
تیرگی سیج تھی بہتے لمحوں کی
جسم پرچھائیوں کی دلدل میں
دھنس گیا تھا کہ دفن کالک کی قبر میں ہو رہا تھا رات کے ساتھ۔
وہ سمندر سیاہ موجوں کا
اژدہائی بھنور، اندھیرے کا
بے سکونی سے کانپتا ساحل
جس کے دُکھ میں نہ تھی ہوا شامل
چھپ کے جو تاڑ کی قطاروں میں
کھڑکھڑاتی تھی ـــــ
اپنے ہاتھوں سے سر بُریدہ سی رات کی رانیں
آئینے میں جو تھی اسیر ـــــ چمک
گدلے پانی کی بے حیائی پر
بُلبلوں میں چھپی، نہ قید ہوئی

ـــــ انتخاب، گلبرگہ

دستاویز

خلا کے سمندر میں پھیلی ہوئی روشنائی میں ڈوبے ہوئے
ہڈیوں کے قلم سے

جلی سرخیوں میں
سیہ چادرِ شب پہ تحریر کر دو
پتے، نام، پیشے، مذاہب
وہیں یہ بھی لکھ دو
ہمارا مقدر
دھوئیں کی لکیروں سے روزِ ازل ہی لکھا جا چکا ہے

——— تحریک، دہلی

سوال

شام آتے ہی
سلگ جاتی ہے زخموں کی چتا
تیرگی روح کی
آنکھوں میں سمٹ آتی ہے
میرے اس جسم کے
تاریک کھنڈر کے اندر
اَن گنت یاس کے سائے ہیں
بہر سو پھیلے
تم مرے پاس ہو پھر بھی
یہ اداسی کیوں ہے

—— تحریک، دہلی

ساحلوں سے کہو: میں نہیں آؤں گا

ساحلوں سے کہو میں نہیں آؤں گا
اب کسی شہر کی رات میرے لیے جگمگائے نہیں
دھوپ بوڑھے مکانوں کی اونچی چھتوں پر مرا نام لے کر بلائے نہیں
میں نہیں آؤں گا
یاد آتا ہے، اک دن کسی سے کہا تھا:
تجھے پہن کر دور کے شہر کی اجنبی دھرتیوں میں اتر جاؤں گا
میں عقیدہ ہوں: مر جاؤں گا
یاد آتا ہے، اک دن کسی نے کہا تھا:
میں تیرے لیے، تیرے احساس کی وادیوں کی گھنی چھاؤں میں پُرسکون نیند
سو جاؤں گی
بے صدا لفظ ہوں: تیری آنکھوں میں کھو جاؤں گی.....

یاد آتا ہے، اک دن مرے روبرو: ایک پُرشور اور بے کراں بحر تھا
یاد آتا ہے اک دن مرے روبرو: میں کوئی بھاگتا، جگمگاتا ہوا ڈوبتا شہر تھا

ایک آواز تھی: دوریوں سے بلاتی ہوئی.....
ایک آواز ہے: دور کے اک اکیلے پہاڑی نگر کے انوکھے سے منظر دکھاتی ہوئی
مجھ سے چھپ کر کہیں دور جاتی ہوئی....

وقت مجھ سے پرے
وقت تجھ سے پرے
میں عقیدہ ہوں
تو بے صدا لفظ ہے۔
اپنے اپنے بدن کے الاؤ میں جل جائیں گے
دور کے / جگمگاتے ہوئے / منتظر ساحلوں سے کہو:
ہم نہیں آئیں گے

——— آجکل، دہلی

غزلیں

سوانگ اب ترکِ محبّت کا رچایا جائے
اس کے پندار کو آئینہ دکھایا جائے

وضع داریِ محبّت کے منافی ہے تو ہو
آج کالر پہ نیا پھول سجایا جائے

شعر میں تذکرۂ دشت و بیاباں ہو مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بسایا جائے

بالکونی وہ کئی دن سے ہے ویراں یارو
اس گلی میں کوئی ہنگامہ مچایا جائے

سر یہ کہتا ہے گوارا نہیں اب بارشِ سنگ
دل یہ کہتا ہے اسی کوچے میں جایا جائے

ہم ہی پیچھے رہیں کیوں دعویِ جاں بازی میں
کیا ضروری ہے کہ مر کر بھی دکھایا جائے

شاعری میں نہ رہا جذبہ و احساس کو دخل
اب اسے قوم کی خدمت پہ لگایا جائے

——— شبِ خون، الہ آباد

روح کے جلتے خرابے کا مداوا بھی نہیں
درد وہ بادل ہے جو کھل کر برستا بھی نہیں

شہر کے زنداں نے پہنا دیں وہ زنجیریں مجھے
میری وحشت کو میسر دل کا صحرا بھی نہیں

جس میں بہہ جائے سفینے کی طرح میرا وجود
میری آنکھوں سے رواں غم کا وہ دریا بھی نہیں

کرب کا سورج سوا نیزے پہ ہے ٹھہرا ہوا
دل مرا ہے برف زار ایسا پگھلتا بھی نہیں

مجھ کو یکجائی کی حسرت سے بھلا کیا واسطہ
میں تو جی بھر کر سر آفاق بکھرا بھی نہیں

مدتوں در پر مرے وہ دستکیں دیتا رہا
میں مگر وہ نیند کا ماتا کہ چونکا بھی نہیں

——— اردو زبان، سرگودھا

شعاعِ مہرِ منوّر شبوں سے پیدا ہو
متاعِ خوابِ مسرّت غموں سے پیدا ہو
گُلِ مراد! سرِ دشتِ نامرادی کھِل
رُخِ نگارِ وفا! محملوں سے پیدا ہو
گماں نہیں مجھے جس سمت سے وہاں سے آ
جو میں نے دیکھی نہیں اُن جگہوں سے پیدا ہو
ہویدا ہو دمِ زندہ ہجومِ مُردہ سے
نوائے شوق! غلط خواہشوں سے پیدا ہو
مثالِ قوسِ قزح بارشوں کے بعد نکل
جمالِ رنگ کھُلے منظروں سے پیدا ہو
فروغِ اسمِ محمدؐ ہو بستیوں میں منیر
قدیم یاد، نئے مسکنوں سے پیدا ہو

——— ادبی ڈائجسٹ، راولپنڈی

درد کی رہگزار پہ چھوڑ کے یوں تو جا مجھے
پھر نہ دکھائی دے کہیں کوئی بھی راستا مجھے

سوزِ دوام کا صلہ میری طرح کسے ملا
جس کے لیے جلا تھا میں، خود وہ بجھا گیا مجھے

ختمِ سفر پہ بھی انھیں طے شدہ مرحلوں میں ہوں
کون کہاں بچھڑ گیا؟ کون کہاں ملا مجھے

دل کو اُداس کر گئی ایک نگاہِ التفات
سارے جہاں کی بے رُخی دے گئی یہ صلا مجھے

بوالہوسانِ شہر کو مژدہ کہ یہ ہجومِ رنگ
میرے لیے ہی تھا مگر راس نہ آ سکا مجھے

عہدِ جنوں کی ساعتیں، خواب نما حقیقتیں
یاد جب آ گئیں تو پھر یاد نہ کچھ رہا مجھے

لمحۂ عافیت کوئی بن نہ سکا نشانِ راہ
لے کے پھری کہاں کہاں عمرِ گریز پا مجھے

——— اوراق، لاہور

خورشید احمد جامی

تمھارے واسطے اب اور کیا ہوں
بس اک ٹوٹا ہوا سا آئینہ ہوں
زمیں کا درد اپنے ساتھ لے کر
خلاؤں میں کسی کو ڈھونڈتا ہوں
مجھے اس طرح پڑھتی ہیں نگاہیں
نئی نسلوں کا جیسے مرثیہ ہوں
خیالوں کی چٹانوں سے اُتر کے
نہ جانے کیوں لبِ دریا کھڑا ہوں
مجھے بھی آؤ سُولی پر چڑھا دو
کہ میں بھی نغمۂ سازِ "انا" ہوں
کوئی سایہ کہیں دیکھا تھا میں نے
بس اتنا زندگی سے آشنا ہوں
اجازت دے اگر دُنیا تو جامی
دلِ تنہا سے ملنا چاہتا ہوں

——— شب خون، الہ آباد

سیاہ ہے دلِ گیتی، سیاہ تر ہو جائے
خدا کرے کہ ہر اک شام بے سحر ہو جائے

کچھ اس روش سے چلے بادِ برگ ریزِ خزاں
کہ دُور تک صفِ اشجار بے ثمر ہو جائے

بجائے رنگ رگِ غنچہ سے لہو ٹپکے
کھلے جو پھول تو ہر برگِ گُل شرر ہو جائے

زمانہ پی تو رہا ہے شرابِ دانش کو
خدا کرے کہ یہی زہر کارگر ہو جائے

کوئی قدم نہ اُٹھے سُوئے منزلِ مقصود
دعا کرو کہ ہر اک راہ پُر خطر ہو جائے

یہ لوگ رہ گزرِ زیست سے بھٹک جائیں
اجل، قوافلِ ہستی کی ہمسفر ہو جائے

بقدرِ یک دو نفس بھی گراں ہے زحمتِ زیست
حیاتِ نوعِ بشر اور مختصر ہو جائے

——— شاعر ہمبئی

فارغ بخاری

شہرِ فردا کے مکیں ایسے مکانوں میں رہے
جو زمینوں میں رہے نے آسمانوں میں رہے

امن کی خوشبو بظاہر بانٹتے پھرتے ہیں وہ
رات دن تیرِ ستم جن کی کمانوں میں رہے

ہائے وہ دوشیزگی لہجے کی گویا عمر بھر
ہم تری آواز بن کر اپنے کانوں میں رہے

لوٹ آئے ریزہ ریزہ ہو کے آخر ہم صفیر
کچھ دنوں تک تو بہت اونچی اڑانوں میں رہے

راکھ کر ڈالا جلا کر آتشِ جذبات نے
برق کی صورت ہم اپنے آشیانوں میں رہے

جن کو اب آنکھیں ترستی ہیں ہماری دیکھیے
ان رُتوں کا ذائقہ کب تک زبانوں میں رہے

راس آئے ان کو کیونکر عہدِ حاضر کی ہوا
جو مقیّد کھوکھلی بسیری داستانوں میں رہے

جانے کیسی آگ تھی دل میں کہ فارغ ہم سدا
رہ کے دریاؤں میں بھی تشنہ دہانوں میں رہے

——— اردو زبان، سرگودھا

نویدِ موسمِ گل تو خزاں سے آئے گی
جو لٹ چکی ہے وہ دولت کہاں سے آئے گی

وہ کون ہے اسے سورج کہوں کہ رنگ کہوں
کروں گا ذکر تو خوشبو زباں سے آئے گی

جدائی کیا ہے، مرا امتحاں تو جب ہوگا
صدا تری، مجھے سارے جہاں سے آئے گی

یہ وقتِ شام، یہ جنگل، یہ خواب خواب فضا
کوئی نہیں ہے تو آہٹ کہاں سے آئے گی

ہے پانیوں کی روانی، ہوا سے نازک تر
ابھر کے موج نہ آبِ رواں سے آئے گی

مجھے گرفت میں لے لیں گی وقت کی کڑیاں
میں کھو گیا تو خبر داستاں سے آئے گی

اگرچہ دونوں طرف تیرگی کے جنگل ہیں
گزر کے بادِ سحر درمیاں سے آئے گی

پلٹ کے دیکھوں گا اپنے نقوشِ پا شہزاد
مجھے خود اپنی خبر رفتگاں سے آئے گی

شہاب جعفری

قیدِ امکاں سے تمنا تھی غمیں چھوٹ گئی
پانو ہم نے جب اٹھایا تو زمیں چھوٹ گئی

میں مسافر ہوں کہاں کا مجھے معلوم نہیں
ہاں بس اتنا کہ مرے گھر کی زمیں چھوٹ گئی

لیے جاتا ہے خلاؤں میں جمالِ شب و روز
دن کہیں چھوٹ گیا رات کہیں چھوٹ گئی

میرے سورج، مرے ہمدم، مری منزل تو بتا
تیرے آفاق تک آیا ہوں، زمیں چھوٹ گئی

اُلجھے اُلجھے سے جو ہم پھرتے ہیں اب شہر بہ شہر
زندگی سی کوئی شے تھی جو کہیں چھوٹ گئی

زندگی کیا تھی، میں اِک موج کے پیچھے تھا رواں
اور وہ موج کہ ساحل کے قریں چھوٹ گئی

گھر جو لوٹے بھی سرِ شام تو کچھ پاس نہ تھا
دن سے پرچھائیں ملی تھی سو کہیں چھوٹ گئی

بود و باش اپنی نہ پوچھو کہ اسی شہر میں ہم
زندگی لائے تھے گھر سے سو یہیں چھوٹ گئی

دل سے دنیا تک اک ایسا ہی سفر تھا جس میں
کہیں دل اور کہیں دنیائے حسیں چھوٹ گئی
نیند لوٹی کہ مری دولتِ افکار لٹی
ایک دنیا مرے خوابوں سے حسیں چھوٹ گئی
صبحدم دل کے مکاں سے سبھی رشتے ٹوٹے
در و دیوار سے فریادِ مکیں چھوٹ گئی
کیا غریب الوطنی سی ہے غریب الوطنی
آسماں ساتھ چلا گھر کی زمیں چھوٹ گئی

——— شاعر، بمبئی

دُور تک دھند لکا ہے دُور تک دھواں دیکھوں
تو کہاں نظر آئے میں تجھے کہاں دیکھوں

نخلِ یاد کا سایہ پَر سمیٹ لیتا ہے
میں شکستہ پا کب تک راہِ رفتگاں دیکھوں

جاتے جاتے اس نے کیا وسعتیں عطا کی ہیں
جس طرف نظر ڈالوں دشتِ بیکراں دیکھوں

راہ بھول بیٹھا ہوں آرزو کی بستی میں
وہ مکیں کہاں ہوگا کون سا مکاں دیکھوں

کچھ نہ کچھ تو اس کو بھی یاد رہ گیا ہوگا
میں تو عمر بھر شاید ایک ہی سماں دیکھوں

پھر سے دل دھڑک جائے پھر سے آنکھ بھر آئے
شاذؔ پھر سرِ راہے اس کو ناگہاں دیکھوں

——— دستاویز، دہلی

ڈھونڈو تو صرف آنچ ہے، شعلہ کہیں نہیں
جلتا ہے دل کہ غم کا سراپا کہیں نہیں

آنکھوں کی خاک دھول کو شبنم سے دھوئیے
جو تھا نگارِ دشت وہ چشمہ کہیں نہیں

شاعر کا ہے وہ خواب، رسولوں کی آرزو
تم جس کو ڈھونڈتے ہو وہ دنیا کہیں نہیں

تفصیلِ غم تو درج ہے لوحِ حیات پر
خود زندگی کا کوئی خلاصہ کہیں نہیں

کہتے تھے کچھ رفیق جو آئے ہیں لوٹ کے
وہ تختۂ گلاب، وہ چشمہ کہیں نہیں

اس گھر میں سب مرید اسی مہرباں کے ہیں
جس پیکرِ جمال کا جلوہ کہیں نہیں

سامانِ صد چمن تھا اٹھائے ہوئے نعیم
وہ کاروانِ ابر جو اترا کہیں نہیں

——— کتاب، لکھنؤ

پچھلے دنوں ہم نے کچھ ایسے تیری راہ تکی ہے
میرے غم پر مت حیراں ہو تو کہ وہ اک اک بات
تجھ سے بچھڑ کر جس سے ملے ہم کچھ ایسے ہی جاتا
کن اہون نیتی لا کے دل کہتا ہے اس کو ڈھونڈیں
کوئی بات بھی ہے جو تجھ کو بولے یہ دن آیا
خود کو جب لگتے تھے اچھے ملنے چلے آتے تھے
جو آنکھیں پوچھا کرتی تھیں، اچھا اب میں جاؤں
آج اٹھا دے شام یہ جینے مرنے کی ہر بات
جیسے رات کو دریا کا سویا سویا سا پانی
خود یہ یقیں لانے کا صدمہ تیرے غم سے بڑا تھا
تیری نظر کیوں کھٹکی میں تو ویسے یونہی کھڑا ہوں
ان آنکھوں نے یوں دیکھا ہے دیکھا نہ ہو جیسے
دیکھو تھوڑا بہت تو ملنا جلنا اب تک ہے ہی
جی سے لگا لیں بس کچھ باتیں اور جدا ہیں، ورنہ
کیا ہم وہ پہلے سے نہیں ہیں، یا کچھ بھول گیا ہے

تیرے آنے کی جیسے ہم سے کچھ بات ہوئی ہے
تیرے لیے برسوں پہلے کی میرے لیے کل کی ہے
جیسے یہ بھی تیرے تعلق ہی کی کوئی کڑی ہے
ہر اک راہ یہاں تو خود ہی رستہ ڈھونڈ رہی ہے
میں بھی ہوں کچھ تیرے لیے یا سب کچھ اب کھوئی ہے
تو نے وہ بھی دکھ دیا ہے، اچھا تیری خوشی ہے
اب اس سے بھی نہیں مطلب کیا کس پہ بیت گئی ہے
آج تو چڑھتے سورج میں بھی اے دل کوئی کمی ہے
پچھلے چند دنوں سے ہم جانے کیسا اپنا جی ہے
دل کو گماں سا رہتا تھا تیری آواز سنی ہے
ویسے تو نے ٹھیک ہی سوچا، رستہ تیرا ہی ہے
مجھ کو بھولنے میں جانے کیا اس پہ بیت رہی ہے
آؤ فاصلے کچھ کم کر لیں، جینا تو پھر بھی ہے
کس کی آنکھوں سے وہ تعلق کی پہچان گئی ہے
د۔ دو ہی ہے سائے وہی ہیں یہ تو شام وہی ہے

اپنی اپنی بات ہیں گھٹ کر جینے والو بولو — وہ جو تعلق ختم ہوا ہے کس کی موت ہوئی ہے
تیرے سامنے ہنسنا آئے نہ تیرے پیچھے رونا — اِن آنکھوں کو چھیڑ کبھی تو اُن پر کیا بیتی ہے
جانے پھر جی کیسا ٹوٹا ہم جو بلک کر روئے — اپنی طرف سے ہنس کے کہا تھا اُن سے ٹوٹ گئی ہے
ہم کو بھلا کر خوش خوش رہنے والے یہ بھی سوچا — بھول سکے تو ہم کو اس میں تیری مدد بھی کی ہے
یہ تو بتا دو ہم سے یہ کس بات پہ ملنا چھوٹا — ویسے جو تم چاہو گے ہونا تو خیر وہی ہے
ان راہوں پہ آکے اکیلے تجھ کو لگا ہے کیسا — کیا اپنے ہی آپ سے تیری کوئی بات ہوئی ہے

آج ہوئی تھیں تلخ سے باتیں، تیرے پیار کی حسرت
کچھ تو اُس کی چپ میں بھی ہے کچھ باتوں میں بھی ہے

——— تحریک دہلی

ہوا چلی تو مرے جسم نے کہا مجھ کو
اکیلا چھوڑ کے تو بھی کہاں چلا مجھ کو
میں کب سے ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنی قسمت کو
یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے ذرا دکھا مجھ کو
دہکتی جلتی ہوئی دوپہر ملی لیکن!
کسی درخت کا سایہ نہ مل سکا مجھ کو
بلا کے شور میں ڈوبی ہوئی صداہوں میں
کسی سے کیا کہوں میں نے کبھی کب سنا مجھ کو
وہ کوئی اور ہے علوی جو شعر کہتا ہے
تم اس کے جرم کی دیتے ہو کیوں سزا مجھ کو

——— کتاب، لکھنؤ

اس زخمی پیاسے کو اس طرح پلا دینا
پانی سے بھرا شیشہ پتھر پہ گرا دینا

ان پتوں نے گرمی بھر سائے میں ہمیں رکھا
اب سوکھ کے گرتے ہیں بہتر ہے جلا دینا

چھوٹے قد و قامت پر ممکن ہے ہنسے جنگل
اک پیڑ بہت اونچا ہے اس کو گرا دینا

اب دوسروں کی خوشیاں چبھنے لگیں آنکھوں میں
یہ بلب بہت روشن ہے اس کو بجھا دینا

ممکن ہے کہ وحشت میں اس طرح کمی آئے
خوابیدہ پرندوں پہ اک گولی چلا دینا

وہ جیسے ہی داخل ہو سینے سے مرے لگ کر
تم کوٹ کے کالر پہ اک پھول لگا دینا

——— شب خون، الہ آباد

بازارِ زندگی میں جسے کیسے اپنا رنگ
ہیں مشتری کے طور نہ سوداگروں کے ڈھنگ

مدّت سے پھر رہا ہوں خود اپنی تلاش میں
ہر لمحہ لڑ رہا ہوں میں اپنے خلاف جنگ

اک نام لوحِ ذہن سے مٹتا نہیں ہے کیوں
کیوں آخر اس پہ وقت چڑھاتا نہیں ہے زنگ

اس سے الگ بھی عمر تو کٹ ہی گئی مگر
ایک ایک پل کے بوجھ سے دُکھتا ہے انگ انگ

شاخِ نہالِ ذہن پہ خوابوں کے پھول ہیں
ہوتا نہ دستِ شوق مرا، کاش زیرِ سنگ

آواز کے حصار میں دل اب بھی قید ہے
مانگے ہے اب بھی پیرہنِ لفظ، ہر امنگ

نازک مزاج ہم تو نہ تھے اس قدر کبھی
ہونا پڑا ہے دیکھ کے دنیا کے رنگ ڈھنگ

کچھ تجربہ بھی اب تو زمانے کا ہو گیا
کچھ دل کے بچپنے سے بھی اب آ گئے ہیں تنگ

——— شب خون، الٰہ آباد

راج نرائن راز

میں سنگلاخ زمینوں کے راز کہتا ہوں
میں گیت بن کے چٹانوں کے بیچ گونجا ہوں

طلوعِ صبح کا منظر عجیب ہے کتنا
مرا خیال ہے، میں پہلی بار جاگا ہوں

کسی نے حال ہی سمجھا نہ بات ہی پوچھی
عجیب کرب کے عالم میں گھر سے نکلا ہوں

عجیب بات ہے، ہر سمت راستے ہیں رواں
عجیب بات ہے، میں گھر کی راہ بھولا ہوں

مجھے تلاش کریں گے نئی رتوں میں لوگ
جو گہری دھند میں لپٹا ہے وہ جزیرہ ہوں

اس اک سوال نے رکھا ہے مدتوں حیراں
میں کس کا روپ ہوں، میں راز کس کی چھایا ہوں

——— تحریک، دہلی

آئے تھے جس طرف سے وہ اک دن، ادھر گئے
برگد کا پیڑ کٹ گیا، سادھو گزر گئے

اک جسم میں اتر گیا اک سال دن بہ دن
ایک ایک کر کے صحن میں پتے بکھر گئے

کرنے لگے قیاس: کہیں قتل ہو گیا
آندھی کا رنگ سرخ تھا سب لوگ ڈر گئے

اب مجھ کو بھول بھال گئے سب معاشقے
ساون کی رت گزر گئی، دریا اتر گئے

لہریں بھی اک پیام، لگن بھی جری جواں
لڑتے رہے، تڑپتے رہے، پار اتر گئے

——— شب خون، الہ آباد

نہ مل سکا کہیں ڈھونڈے سے بھی نشان مرا
تمام رات بھٹکتا رہا، گمان مرا
میں گھر بسا کے سمندر کے بیچ، سویا تھا
اٹھا تو آگ کی لپٹوں میں تھا مکان مرا
جنوں نہ کہیے اسے، خود اذیتی کہیے
بدن تمام ہوا ہے، لہو لہان مرا
ہوائیں گرد کی صورت اڑا رہی ہیں مجھے
نہ اب زمیں ہی مری ہے نہ آسمان مرا
دھمک کہیں ہو، لرزتی ہیں کھڑکیاں میری
گھٹا کہیں ہو، ٹپکتا ہے سائبان مرا
مصیبتوں کے بھنور میں پکارتے ہیں مجھے
عجیب دوست ہیں، لیتے ہیں امتحان مرا
کسے خطوط لکھوں، حالِ دل سناؤں کسے
نہ کوئی حرف شناسا، نہ ہم زبان مرا

——— شب خون، الہ آباد

شمیم حنفی

کیسی کیسی صورتیں اے دل دکھاتا ہے مجھے
کس لیے آخر تو آئینہ بناتا ہے مجھے

ڈوبتے سورج کا ہر منظر مری آنکھوں میں ہے
کیسا پاگل ہے، اندھیروں سے ڈراتا ہے مجھے

میں چراغِ راہ ہوں لیکن فقط اپنے لیے
کیا بگڑتا ہے ترا، تو کیوں بجھاتا ہے مجھے

کون سی منزل پہ لائی ہے مجھے اپنی ہوس
کیا سمجھ کر میری آنکھوں سے گراتا ہے مجھے

وہ اچٹتی سی نظر بس ایک پل کی بات تھی
اب وہی لمحہ ہواؤں میں اڑاتا ہے مجھے

ان جزیروں کو خبر کر دے جو آگے آئیں گے
پانیوں کی طرح یہ دریا بہاتا ہے مجھے

پھر فصیلِ شہر تک جا کر پلٹ آؤں گا میں
پھر وہی جنگل کا سناٹا بلاتا ہے مجھے

خاک اندر خاک میری عمر بھر کی جستجو
دائرہ در دائرہ کوئی گھماتا ہے مجھے

—— شب خون، الہ آباد

مصوّر سبزواری

ساتھ ہی گُل کے قبیلے کے گزر جاؤں گا
آخری پتّہ گرے گا تو میں مر جاؤں گا

منتظر ہے کوئی صدیوں سے یہاں پر میرا
آج میں اس گھنے جنگل میں اتر جاؤں گا

بارِ کشتی پہ تھا ساحل کا بھی کیوں بوجھ بنوں
میں اسی ڈوبتی کشتی میں ٹھہر جاؤں گا

تشنگی دشتِ بدن کی کسی دریا سے بجھا
میں چڑھتی ریت کا بادل ہوں اتر جاؤں گا

دھند چہروں کی نہ بجھنے دو سرِ شامِ خزاں
ننگی پرچھائیو مت آؤ میں ڈر جاؤں گا

نقشِ دیوار نہیں میں جو مصوّر دھندلاؤں
زخمِ دیوار ہوں ہر شام اُبھر جاؤں گا

——— تحریک، دہلی

عجب صدا یہ نمائش میں کل سنائی دی
کسی نے سنگ سے تصویر کو رہائی دی

سنہری حرف بھی مٹی کے بھاؤ بیچ دیے
تجھے تو میں نے نئے ذہن کی کمائی دی

بچا سکی نہ مجھے بھیڑ چیر کے قاتل سے
ہزار شور مچایا، بہت دہائی دی

وہ شخص مر کے بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکا
کہ اک زمانے نے جنبش تو انتہائی دی

کبھی وہ لوٹ کے بکھرا، کبھی وہ جمع ہوا
خدا نے اس کو عجب معجزہ نمائی دی

——— اُردو زبان، سرگودھا

سلطان اختر

شام ہوئی تو یادوں کا قالین بچھا کر لیٹ گئی
میرے کمرے میں تنہائی پر پھیلا کر لیٹ گئی

وقت سے پہلے ہی موسم کو رنگ بدلتے دیکھا تو
خوش فہمی ٹھنڈی سانسوں کا سنکھ بجا کر لیٹ گئی

کچھ سائے تو رات ڈھلے تک آس لگائے کھڑے رہے
اِک پرچھائیں کھڑکی کا پردہ سرکا کر لیٹ گئی

تھکی تھکی آنکھوں پہ جب بھی خوابوں کی دیوار گری
سہمی سہمی نیند مرے پہلو میں آ کر لیٹ گئی

چاند کا گھر ویران پڑا ہے، سورج کا دروازہ بند
سونی گلیوں میں تاریکی صدا لگا کر لیٹ گئی

——— شاخسار، آٹک

پھر اختلاف کوئی سابقہ ہی لے جاؤں
اب اس کے سامنے اس کا گلہ ہی لے جاؤں

شکستہ جسم، بریدہ زباں، دریدہ لباس
میں اپنا آپ ہی اپنی گواہی لے جاؤں

دھلے ہوئے ہیں شجر اور زمیں نہائی ہوئی
میں کس طرف یہ بدن کی سیاہی لے جاؤں

سفر میں زادِ سفر کچھ تو پاس ہو میرے
چلا ہوں گھر سے تو اپنی نواہی لے جاؤں

ترا یہ کرب کہ تُو لُٹ گیا یہاں آ کر
مجھے یہ فکر کہ خود کو بچا ہی لے جاؤں

بھری ہوئی ہے جو بس میرے تذکرے سے نسیم
میں اس کی ڈائری اس کا لکھا ہی لے جاؤں

——— اوراق، لاہور

ممتاز راشد

آنکھوں میں عکس، سانس میں زلفوں کی باس ہے
وہ دُور جا چکا ہے مگر میرے پاس ہے

بجھتی نہیں ہے دل کے در و بام کی چمک
پوشیدہ اس کھنڈر میں ابھی کوئی آس ہے

چھینٹے پڑیں تو اور بھڑکتی ہے تشنگی
میرے وجود میں کسی صحرا کی پیاس ہے

کیسے جمے گی شاخِ تمنّا پہ غم کی دھول
اس کے بدن پہ میری وفا کا لباس ہے

راشد بتا رہا ہے حسیں شام کا سکوت
مجھ سے بچھڑ کے اس کی صدا بھی اُداس ہے

—— تحریک، دہلی

ہاں ہم کو بھی ہے یہ خبر کہ چاند گگن میں نکلا تھا
لیکن ایک اک انگ پہ میرے رات تھکن کا پہرا تھا
ڈرا ڈرا سا، سہما سہما خاموشی کے جنگل میں
جو پتوں پر رینگ رہا تھا آوازوں کا سایا تھا
رُک کر اُس کا حال جو میں نے پوچھا اس سے ٹھیک کیا
ویسے میں بن ملے ہی اس سے بڑھ جاتا تو اچھا تھا
کل کی رات بھی جاگ کے میں نے دروازے پر کاٹی تھی
کل کی رات بھی میرے گھر میں تنہائی کا ڈیرا تھا
مجھ کو خبر تھی کیا اس کی کہ سرد ہوائیں آتی ہیں
میں نے تو کچھ اور سمجھ کر دروازوں کو کھولا تھا
بس اتنی سی بات پہ مجھ سے بوڑھی نسلیں ہیں برہم
بس اتنا سا جرم ہے میرا خود کو سمجھنا چاہا تھا

——— اردو زبان، سرگودھا

ماجد الباقری

پردے کے آگے شہر ہے اور وہ بھی گھر میں ہے
آنگن بغیر گھر تو سبھی کی نظر میں ہے

سمتیں الگ الگ ہیں مگر میرے ساتھ ساتھ
خود چاند بھاگتا ہے کہ بادل سفر میں ہے

کانٹوں پہ جا پڑوں کہ چٹختی چٹان پر
بستر کا لطف اب بھی مرے بال و پر میں ہے

جو کچھ تھا سب کے پاس، زمیں پر بکھر گیا
وہ چیز ڈھونڈیئے جو فقط میرے سر میں ہے

بے خوف ہو تو اور بھی ننگِ وجود ہو
لفظوں کا یہ لباس جو تھوڑے سے ڈر میں ہے

——— صبحِ نو، پٹنہ

بشیر احمد بشیر

سایۂ ابر و شجر یاد آیا
کن دیاروں کا سفر یاد آیا

بے خیالی میں اٹھاتے ہی کتاب
کوئی کھلتا ہوا در یاد آیا

ذہن میں شعر کا مضموں ابھرا
ایک محتاط نظر یاد آیا

چھوڑ دیں شہر، بجا ہے لیکن
کیا کریں گے وہ اگر یاد آیا

کیا عجب لوگ تھے کیا بستی تھی
ایک دن بھی تو نہ گھر یاد آیا

سحر و شام بھلایا اُس کو
سحر و شام مگر یاد آیا

اتفاقاً تجھے دیکھا تو بشیر
حلقۂ اہلِ ہنر یاد آیا

——— اوراق، لاہور

جس طرف دیکھئے صحرا نظر آتا ہے مجھے
ان گنت صدیوں کا بن باس ڈراتا ہے مجھے

تیر سا ٹوٹتا رہتا ہوں ہر اک پتھر پر
کون یہ اپنی کمانوں سے چلاتا ہے مجھے

کوئی آواز، نہ مشعل، نہ اشارہ کوئی
راہ یہ کون اندھیرے میں دکھاتا ہے مجھے

وہ مسافر ہوں کہ پہنچا نہیں اپنے گھر تک
دیر سے روح کا ویرانہ بلاتا ہے مجھے

یوں تو میں قطرۂ شبنم ہوں ذرا سا لیکن
سیکڑوں نیزوں سے خورشید اٹھاتا ہے مجھے

——— کتاب، لکھنؤ

شکیل مظہری

ٹہنی سے پھول، شاخ سے پتّہ جدا ہوا
انکی بہار میں تو عجب ماجرا ہوا
کی گفتگو تو زخمِ تمنّا ہرا ہوا
لہجے کی نرمیوں میں چھپا خنجر چھپا ہوا
تاریک کیوں ہے دور تلک رہگزارِ شعر
گیتوں کی آنچ، درد کے شعلوں کو کیا ہوا
سب گھاؤ دل کے وقت کے مرہم سے بھر گئے
لیکن تمھارا درد نہ دل سے جدا ہوا
ایسے خفا ہوئے کہ کبھی آشنا نہ تھے
ایسے گئے کہ پھر نہ کبھی لوٹنا ہوا
بکھرے ہوئے پڑے ہیں جہاں خوابِ آرزو
ہر ذرّہ اس فضا کا ستارہ نما ہوا

——— کتاب، لکھنؤ

آزاد گلاٹی

اپنے اندر کے سُونے پن سے جب آپ ڈروں
خالی راہوں پر یادوں کی انگلی تھام چلوں
کیا جانے کس موڑ پہ مجھ کو میرا پتہ مل جائے
میں شہرِ احساس میں شب بھر رُک رُک پاؤں دھروں
شاید مڑ کر دیکھنا تیرے بس کی بات نہ ہو
کیوں تجھ کو مشکل میں ڈالوں؟ کیوں آواز بھی دوں؟
سورج بن کر دن بھر سلگوں شام ڈھلے کھو جاؤں
صبح جب اپنے آپ کو پاؤں، دن بھر اور جلوں
باہر موت سی خاموشی ہے دل میں ہیں طوفان
باہر جب پتہ کھڑکے، تو چین کا سانس میں لوں
جسم اگر چُپ ہو تو رُوح کا گنبد گونج اٹھے
آوازوں کا طوفاں ٹھہرے تو میں کچھ سوچوں
آگے خواب ہیں پیچھے سائے اندر ایک خلا
اور آزاد! میں اک ان دیکھے تن کی کھوج کروں

——— تحریک، دہلی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

غلام مرتضیٰ راہی

جو نہ چاہوں، وہی ہُوا جائے
اب جہاں تک یہ سلسلہ جائے
چاک در چاک پیرہن پہ نہ جا
باوجود اس کے دم گھُٹا جائے
نقش بر آب ہے مری تحریر
جو بناؤں وہی مٹا جائے
بارِ احساں نہ رکھ کہ میرا وجود
اپنے ہی بوجھ سے دبا جائے
جن کی پہنائیاں نہ ناپ سکوں
اُن فضاؤں میں دم گھٹا جائے
لمحہ لمحہ، بغیرِ بال و پر
مجھ کو لے کر کہیں اڑا جائے

—— تحریک، دہلی

مظفر حنفی

ہوا لگی تو ہوس کا مکان بیٹھ گیا
شکستہ چھت کی طرح آسمان بیٹھ گیا

یہ کون جاتا ہے تاروں کی گرد راہ کے ساتھ
خلا میں کس کے قدم کا نشان بیٹھ گیا

مری نگاہ مرے عکس کو ترستی ہے
ہر آئینے میں وہی مہربان بیٹھ گیا

ملن ہوا بھی تو رسوائیوں کے جنگل میں
کہ خوف اُس کے مرے درمیان بیٹھ گیا

کدھر گئی، مری آوارگی! پکار مجھے
غبار لے کے مرا امتحان بیٹھ گیا

—— صبح نو، پٹنہ

ہم پردۂ غزل میں چھپا لائے ہیں اسے
لفظوں کی پالکی میں بٹھا لائے ہیں اسے

اب تک تھے اپنے گھر میں تو اچھا بھلا تھا دل
باہر نکل کے روگ لگا لائے ہیں اسے

اس سنگدل کے ہاتھ کی خوشبو ہی سونگھ لیں
پتھر جو آ لگا تھا اٹھا لائے ہیں اسے

وہ دلربا نجومی جو آیا ہے شہر میں
ہم آج اپنا ہاتھ دکھا لائے ہیں اسے

انساں ہیں ہم تو دل کسی انساں کو کیوں نہ دیں
پریوں کی بستیوں سے بچا لائے ہیں اسے

——— تحریک، دہلی

سلیمان خمار

تمہارے شہر میں جس راہ سے نکلتے ہیں
ہزاروں فتنے ہر اک گام ساتھ چلتے ہیں
ملا جو آج میں اس سے تو یہ ہوا معلوم
کہ کیسے موم سے دل پتھروں میں ڈھلتے ہیں
اداس اداس سی تنہائیوں کے کمرے میں
حسین سانولی سی یادوں کے بدن پگھلتے ہیں
جو پھول نکہتیں تقسیم کر رہے تھے کبھی
وہ پھول آج فضا میں شرر اگلتے ہیں
حسین خواب کہاں زندگی کی آنکھوں میں
ملال و یاس کے تاریک سائے پلتے ہیں
اک ایک موڑ پہ افکار کی گلی میں خمار
وہ آنچ ہے کہ خیالوں کے جسم جلتے ہیں

—— کتاب، لکھنؤ

خود سے بھی کبھی حساب لیں ہم
غیروں ہی کے عیب کیوں گنیں ہم
قربان تری نوازشوں کے
اتنا نہ ہنسا کہ رو پڑیں ہم
حالات کی یہ ستم ظریفی؟
ناخوب کو خوب تر کہیں ہم
برہم ہے مزاجِ اہلِ دانش
اے وحشتِ دل کدھر چلیں ہم
شائستۂ زندگی ہیں صابر
ہر حال میں کیوں نہ خوش رہیں ہم

——— تحریک، دہلی

احمد آباد ۱۹۶۹ء

احمد آباد کے دوستوں کے نام

سارے ہنگامۂ بیداد میں اپنا حصّہ
ایک احساسِ ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے دامن پہ نہیں خون کا دھبّہ پھر بھی
اپنی ہی ذات پہ قاتل کا گماں ہوتا ہے

——— تحریک، دہلی

احمد آباد

آگ کا ذائقہ ہر زباں پر سلگتا ہوا خم تھا
رات کا آہنی در سمندر کی جانب کھلا
آگ ہی آگ تھی
قطرۂ آب پر کارسا خواب تھا
رات کا آہنی در جہنّم کی جانب کھلا

راستوں نے کہا کیوں ہجومِ فراواں کا انجام عبرت ہوا
کون عبرت کے احساس کو مانتا
موت کو زندگی، زندگی کو جہنّم۔ فسانہ تمسخر کا حیرت ہوا
ہم سفر تھے وہ اک دوسرے کے لیے
قرب ان کا مگر آتشِ خوف تھا
موج سے موج لڑتی ہوئی
موج سے موج نذر کے آلام میں جیسے ڈھلتی ہوئی
کھڑکیاں رہ گزر پر مقدر کی مانند کھلتی رہیں
جو تماشائی اُن کے اندھیروں سے ابھرا وہ جلتا گیا

وہ تو ننھّا تھا، معصوم تھا
اس کو سورج کا یا چاند کا عکس سب نے کہا
وہ کبھی جلنے لگا، وہ کبھی بہتے لہو میں پگھلنے لگا
وہ تو ننھّا تھا، معصوم تھا
وہ مسیحا تھا، وہ آخری نور تھا، اس کی تقدیر میں
مرگِ بیکار کیوں آج لکھّی گئی
آسماں تک سلگتے ہوئے، جرم کے شہر میں
چاٹتا ہوں لہو ذائقے سے مگر میں پریشاں نہیں
چاٹتے ہو لہو ذائقے سے مگر تم پریشاں نہیں
میں جو زندہ ہوں میں کون ہوں؟
تم جو زندہ ہو تم کون ہو؟

——— مورچہ، گیا

مخمور سعیدی

جن سے آنکھیں بچالی گئی تھیں کبھی سامنے پھر نہ وہ عکس لائے گئے
آئنوں سے گریزاں تھی جن کی نظر حشر کے دن وہ اندھے اُٹھائے گئے

اندھے بہروں کی بستی کے اک چوک میں رات بھر کل الوکھا تماشا رہا
اُس کی آیات کی رونمائی ہوئی، اُس کے پیغام پڑھ کر سُنائے گئے

یہ پُرانے یُگوں کی کہانی نہیں میرے اپنے زمانے کی تاریخ ہے
دن دہاڑے لُٹیں سینکڑوں بستیاں، شہر کے شہر زندہ جلائے گئے

قطرہ قطرہ لہو جو زمیں پر گرا ظلمتِ وقت میں دیپ بن کر جلا
قتل گاہوں کی اُونچی منڈیروں پہ جب خوں میں لتھڑے ہوئے سر سجائے گئے

زندگی بھی سراسر اک الزام تھی، موت بھی کیا ہے اک تازہ الزام ہے
اپنی معصومیت میں رہے ہم مگن لاکھ الزام ہم پر لگائے گئے

تھا یہی حاصلِ جستجوئے نظر، اپنی آنکھوں نے دیکھا ہے صرف اس قدر
سامنے بس گھڑی دو گھڑی کے لیے دھندلے دھندلے سے منظر کچھ آئے گئے

تھے وہ مخمور اپنے تجسس میں خود یا کسی اور کی جستجو تھی انھیں
شہر کی سُونی سڑکوں پہ ہر شام کو کھوئے کھوئے سے کچھ لوگ پائے گئے

——— تحریک، دہلی

عادل منصوری

زخمی سورج نے جب آنکھ کھولی یہاں

زخمی سورج نے جب آنکھ کھولی یہاں
خنجروں کی چمک سے وہ اندھا ہوا
بے یقینی کے بادل گرجنے لگے
گھر سے نکلے تو گھر کا نشاں مٹ گیا
روح اور جسم کا سلسلہ مٹ گیا
ہاتھ اُٹھے جو دعا کے لیے کٹ گئے
خوں کے رشتوں کی کڑیاں ملیں دھول میں
دھول حرفِ تعارف پہ پردہ بنی
دھندلے دھبّوں کی پہچان مشکل بہت
دُور افق کے کناروں سے شعلے اُٹھے
رات کے جسم سے آگ روشن ہوئی
راہ میں انگنت چیونٹیاں پس گئیں
اک کبوتر دریچے میں سہما ہوا

اپنی آواز سے خوف کھاتا رہا
اب نہ در ہے نہ دیوار ہے درمیاں
اور زمیں پاؤں رکھنے کے قابل کہاں

آنسوؤں سے سرابوں کو بھرتے چلو
دشتِ ہجرت کو سیراب کرتے چلو

——— مورچہ، گیا

صادق

ہم اپنے ہی گھر کے پناہ گزیں

دشاؤں کے گربھاشیوں میں
کلبلا رہا ہے نراج
وقت کی ران سے
کٹے ہوئے کسی لمحہ جنمی
اُروشی کے ناجائز بیٹوں نے
قانون کو پگھلا کر
اپنے لئے بنا ڈالی ہیں ڈھالیں ـــــ اور ہتھیار
اور ـــــ بکھر گئے ہیں سب، انھیں لے کر
گلیوں، سڑکوں، چوراہوں
اور مکانوں میں ـــــ کاٹے جا رہے ہیں ہمارے
ہاتھ، پاؤں، زبانیں اور سر
گنگنا خون یا تو اُڑایا جا رہا ہے
یا بہایا
لیکن تمام فرش اور آستینیں بے داغ ہیں

ـــــ انتخاب، گلبرگہ

یہ گرتا ہوا شہر میرا نہیں

یہ آگ اور خوں کے سمندر میں گرتا ہوا شہر میرا نہیں ہے
ہوا سے الجھتا ہوا میں اڑا جا رہا ہوں اندھیرا ہے گہرا، گھنا، بے اماں
رات کے دشت میں تیرے، میرے مکاں
دور ہوتے چلے جا رہے ہیں
لہو کے اجالے بھی معدوم ہیں
اور تاریک گنبد میں معصوم روحوں کے کہرام ہیں
بے صدا آسماں کی طرف
خوں میں لتھڑے ہوئے ہاتھ اٹھتے ہیں، تحلیل ہو جاتے ہیں
اور کہیں دور — اپنی فصیلوں کے اندر بکھرتی ہوئی نامرادوں کی بستی کے اوپر
ہوا سے الجھتا ہوا میں اڑا جا رہا ہوں، اندھیرا ہے گہرا، گھنا، بے اماں
میں بلاتا ہوں، آواز دیتا ہوں اب اُس حسیں شہر کو
جو پرانی زمینوں کے نیچے کہیں دفن ہے
کوئی آواز کانوں میں آتی نہیں ہے

میں شاید پرانی زمینوں کے نیچے : بہت دور نیچے کہیں دفن ہوں
خوں میں لتھڑے ہوئے ہاتھ
تاریک گنبد
یہ اندھی ہوا
بھڑ بھڑاتا ہوا ایک زخمی پرندہ
کہیں دور : اپنی فصیلوں کے اندر بھرتی ہوئی نامرادوں کی بستی کے اوپر
میں جلتے پروں سے اڑا جا رہا ہوں
یہ آگ اور خوں کے سمندر میں گرتا ہوا شہر میرا نہیں ہے

—— تحریک، دہلی